اُردو ریسرچ جرنل "تشکیل" جلد:3، شمارہ:1 (جنوری تا جون 2025ء)
ISSN (Online): 3007-3294, ISSN (Print): 3007-3286, HEC Recognized Y-Category Journal

ہاجرہ ریاض
پی ایچ ڈی اُردو اسکالر، وفاقی اُردو یونیورسٹی، اسلام آباد
ڈاکٹر ناہید قمر
ایسوسی ایٹ پروفیسر اُردو، وفاقی اُردو یونیورسٹی، اسلام آباد

ناول "خس و خاشاک زمانے" میں ثقافتی بازیافت

Hajra Riaz
PhD Urdu Scholar, Federal Urdu University, Islamabad
Dr. Naheed Qamar
Associate Professor Urdu, Federal Urdu University, Islamabad

Cultural Resurgence in Novel *Khas o Khashak Zamanay*

ABSTRACT

In the 20th century, Urdu literature embraced new genres and themes, with the novel emerging as a powerful medium to depict contemporary life and socio-cultural realities. While cultural discourse in Urdu literature is relatively recent, evolving political and social conditions made its inclusion essential. Literature, both prose and poetry, began reflecting cultural concerns tied closely to civilization and the individual. Civilization stems from collective needs and structured living, while culture arises from aesthetic pursuits that define identity. Culture plays a vital role in shaping national recognition through customs, values, and traditions. *Khas-o-Khashak Zamana*, a novel by Mustansar Hussain Tarar, serves as a significant example of cultural recovery. It portrays a society in flux, undergoing intense socio-political and cultural transformations. The narrative explores how individuals either cling to their cultural roots or abandon tradition and identity for survival. The novel becomes a lens to study cultural preservation and erosion in modern contexts.

Keywords: *Cultural Resurgence, Curltural Discourse, Civilization, Cultural Identity, Recovery, Khas-O-Khashak Zamanay, Mustansar Hussain Tarar, Trasnformations, Bazyaft*

بیسویں صدی میں اردو ادب میں جہاں نئی اصناف متعارف ہوئیں وہیں فکری میدان میں بھی ادب نے کئی نئے موضوعات کو اپنے دامن میں سمیٹا۔ اردو ادب میں ثقافتی مباحث زیادہ پرانے نہیں ہیں۔ ناول جو کل زندگی کا احاطہ کرنے پر قادر تھا سماجی و ثقافتی منظر نامے کو بھی بیان کرتا گیا۔ سماجی و سیاسی صورت حال کے تناظر میں ضرورت محسوس

ہوئی کہ ناول میں ثقافتی موضوعات کو بھی زیر بحث لایا جائے۔ تمدن، تہذیب اور ثقافت کا تعلق فرد سے ہے۔ دھرتی کے اوائل افراد نے اپنی بقا کی خاطر گروہ میں رہنے کو ترجیح دی۔ یہی انسانی گروہ اپنے تحفظ اور ضروریات کے سبب شہر بساتا گیا جہاں سے تمدن کی بنیاد پڑی۔ جب فرد کی تمدنی زندگی کا آغاز ہوا تو اسے کچھ ضوابط درکار ہوئے جن سے وہ اپنی معاشرتی زندگی کو سنوار سکتا تھا، آگے چل کر یہی اصول تہذیب کہلائے۔ اب تہذیب یافتہ انسان جمود کی حالت میں رہنے سے قاصر تھا لہذا اس نے جمالیاتی حس کی تسکین کے لیے مختلف مشاغل کی طرف غوروفکر شروع کیا۔ جو کہ ثقافت کہلائے۔ ثقافت کا افراد کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے کیوں کہ قوموں کی پہچان ثقافت سے ہی ممکن ہوتی ہے۔ دراصل ثقافت کسی بھی معاشرے کے ان رسوم و رواج ،اقدار وغیرہ کو کہا جاتا ہے جن پر پورا انسانی معاشرہ عمل پیرا ہو۔ مستنصر حسین تارڑ کا ناول "خس و خاشاک زمانے" ثقافتی بازیافت کی کوشش ہے۔ یہ ناول ایسے معاشرے کی داستان ہے جو مختلف سماجی سیاسی اور ثقافتی تبدیلیوں سے دوچار تھا جہاں فرد اپنی ثقافت سے جڑا رہا یا تو بقا کے لیے روایات ،شناخت اور ثقافتی اقدار کو کچل کر آگے بڑھتا گیا۔

بیسویں صدی اردو ادب کے حوالے سے خاصی ثروت مند ثابت ہوئی ہے، دیگر اصناف کی طرح ناول نے بھی اس صدی میں رواج پایا۔ ناول نثری قصے کی وہ صورت ہے جو انسانی زندگی کی سرگزشت کا کلی طور پہ احاطہ کرتی ہے۔ ناول کو محض زندگی کا آئینہ ہی نہیں کہا جاسکتا بلکہ یہ پورے عہد کو بیان کر رہا ہوتا ہے۔ ناول کے ذریعے گزرے عہد کی تاریخ کو معلوم کیا جاسکتا ہے۔ ناول نگار اپنے زمانے کے لوگوں کے حالات، کیفیات، واقعات ،، ثقافتی اقدار، اظہار کے مختلف وسائل اور فکری رجحانات کو ناول میں سموتا ہے۔ کہانی بیان کرنے کے یہ عوامل بعد کے آنے والے لوگوں کے لیے معلومات کا بہترین وسیلہ بن جاتے ہیں۔ اس طرح ناول قاری کو اس عصر میں لے جاتا ہے جہاں وہ وجود پذیر ہوتا ہے۔ گویا ناول گونا گوں موضوعات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ بیسویں صدی میں بدلتے رجحانات نے زندگی کے دیگر شعبوں کو جہاں متاثر کیا وہیں ادبی دنیا میں حرکت یافتہ اذہان اس تبدیلی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ سماجی و معاشی صورت حال اور ان کے تناظر میں اٹھنے والی تحاریک، نئے نظریات اور مباحث کو ناول میں کھل کر بیان کیا گیا۔ اس ضمن میں ناول کا خاصا ہے کہ وہ متنوع موضوعات کا مرکب ہے۔ ناول نگار بنیادی موضوع کے ساتھ ضمناً دوسرے موضوعات کا ذکر کرتا ہے جہاں سے قاری اپنے نفسیاتی رجحان کو دیکھتے ہوئے موضوع اخذ کرلیتا ہے۔ بیسویں صدی میں ثقافتی و مذہبی شدت پسندی اپنے عروج پہ تھی اس کے ساتھ شناخت کا مسئلہ بھی درپیش رہا ہے۔ دیگر موضوعات کی طرح ان مسائل کو بھی بیسویں و اکیسویں صدی کے ناول نگاروں نے بیان کیا ہے۔ ثقافت اور اس کے مظاہر اس دور کی تخلیقات میں بڑے پیمانے پر نظر آتے ہیں۔

تہذیب سے مراد کسی قوم کے بنیادی افکار اور نظریات ہوتے ہیں۔ ابتدا میں جب کسی فرد کو گروہ میں شامل کیا جاتا تھا تو اسے کچھ ذمہ داریاں دی جاتی تھیں جو کہ اس کی بقا کے لیے ضروری تھیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پورے انسانی گروہ نے اپنے لیے کچھ اصول وضوابط مقرر کر لیے۔ جیسے ہی انسان نے اپنے لیے زندگی کو آسان کرنے کے طریقہ کار سیکھے یہ گروہ منظم سے منظم تر ہوتے گئے اور الگ الگ خصوصیات کے متحمل ٹھہرے۔ ان کی یہ منفرد پہچان، نظریہ کائنات، اقدار اور فکری رجحان ہی تہذیب ٹھہری۔ تہذیب دراصل افراد کی ترقی واخلاقیات کا معیار ہوتا ہے۔ دنیا میں بے شمار اقوام ہیں۔ ہر قوم دوسرے سے جدا زندگی گزارنے اور دوسروں سے مختلف عادات واطوار کی حامل ہوتی ہے۔ یہی وہ عوامل ہوتے ہیں جو اقوام کو ایک دوسرے سے مختلف کرتے ہیں۔ انسان کی ابتدا سے ہی تہذیب کا آغاز ہوتا ہے لیکن آبادی کے محدود ہونے کے باعث ایک ہی طرح کی طرز پہ زندگی استوار کی جاتی تھی، مگر جوں جوں شعور بڑھتا گیا زندگی کی ضروریات بڑھتی گئیں اور ان کی تکمیل نے افراد کو نت نئے کارنامے سرانجام دینے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ ہجرت کرنے پہ آمادہ کیا۔ تہذیب کے لغوی معنی آراستہ کرنے کے ہیں اصطلاحی حوالے سے تہذیب اُس نظم شدہ طریقے کو کہا جاتا ہے جس سے کسی شے کے محاسن، طبعی اور مطہر صورت میں سامنے آجائے۔ گویا وہ اصول جو اجتماعی زندگی استوار کرنے میں مددگار ہیں انہیں تہذیب کہیں گے۔ تہذیب کی حدود یا تعریف کے تعین میں مفکرین کسی ایک نکتے پر متفق نہیں، تاہم تہذیب ایک وسیع وجامع اصطلاح ہے جو سماج کی فکر، ذہن اور سوچنے کے میلانات پر منحصر ہے۔ سید عابد حسین کے مطابق:

> "تہذیب نام ہے اقدار کے ہم آہنگ شعور کا جو ایک انسانی جماعت رکھتی ہے۔ جسے وہ اپنے اجتماعی اداروں میں ایک معروضی شکل دیتی ہے۔"(1)

لفظ تہذیب وسعت کا حامل ہے۔ قوموں کو ایک دوسرے سے مختلف طرز زندگی عطا کرنا تہذیب سے ہی ممکن ہے۔ تہذیب کے ساتھ ساتھ ثقافت کی اصطلاح ایک ہی معنوں میں استعمال کی جاتی رہی ہے مگر ان میں فرق موجود ہے۔ ثقافت کے لفظی معانی آرائش وزیبائش ہیں مگر اب ثقافت کے لفظی معنوں تک ہی محدود نہیں رہا جا سکتا۔ ڈاکٹر عبدالباری ثقافت کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

> "ثقافت گروہ کے طرز حیات کا نام ہے۔۔۔ اس کی وضاحت یوں کی جا سکتی ہے کہ معاشرہ افراد سے بنتا ہے اور افراد جس طرح برتاؤ کرتے ہیں اسے ثقافت کا نام دیا جا سکتا ہے۔"(2)

فرد اور کلچر کا آپس میں گہرا تعلق ہے افراد زندگی گزارنے کے اصول متعین کرتے ہیں۔ جس میں باہمی تعاون کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ کلچر یا ثقافت ان تمام خصوصیات کے مرکب کو کہا جاتا ہے جو کسی خاص قوم، سوسائٹی اور

جماعت کے افراد میں قدر مشترک ہوتی ہیں۔ یہ مرکب افراد کے عقائد، آداب، قوانین، رہنے کے ڈھنگ، اطوار، رسوم، اصول، آلات، اشیا، مذہب، تعلیم، صحت، خاندان، پیشے جغرافیہ اور زبان پر مشتمل ہوتا ہے۔ کلچر کی انہی خصوصیات کی بناء پر کوئی بھی قوم، معاشرہ یا اجتماع اپنی جداگانہ پہچان رکھتے ہیں۔ کلچر یا ثقافت ایسا بندھن ہوتا ہے جو اجتماعی خصوصیات کی بنیاد پر اشخاص کو ایک دوسرے کے قریب لاتا ہے۔ ثقافت اور معاشرہ بنیادی طور پر لوگوں کے اس گروہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو ایک خاص علاقے میں مل کر رہتے ہیں، کام کاج کرتے ہیں اور اپنے اس باہمی عمل سے ایک دوسرے کو متاثر کرتے ہیں۔ عمومی طور پر تہذیب و ثقافت کو ہم معنی سمجھا جاتا ہے ۔ اس کی وجہ انگریزی، اردو میں مستعمل الفاظ اور ان کے مختلف تراجم ہیں مگر ان میں معمولی فرق بھی موجود ہے اور وہ فرق یوں ہے کہ اگر ایک جگہ مسجد تعمیر کی جائے تو اس میں مسجد کی تعمیر کا جذبہ یعنی "مسجد پن" تہذیب ہو گی اور مسجد کی یہ طرز تعمیر مذہبی ثقافت کے زمرے میں آئے گا۔ اسی طرح بالباس ہونا تہذیب ہے جب کہ لباس کا انداز و طرز ثقافت کی ذیل میں شمار ہو گا۔ گویا تہذیب و ثقافت ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم بھی ہیں اور ان ہی اقدار و روایات سے کسی قوم کی تاریخ کی معلومات بھی حاصل کی جاتی ہیں۔

تاریخ میں یہ عمل دیکھا گیا ہے کہ جب بھی اقوام وقت کے دھارے میں ترقی کی طرف بہنا شروع کرتی ہیں تو اپنے بہت سارے ثقافتی عناصر (لباس، زبان، رسوم و رواج، فنون لطیفہ و مفیدہ ، علمی و عملی روایات) کو پیچھے چھوڑ دیتی ہیں یا ترقی کی دوڑ میں ان عناصر کو فراموش کر دیا جاتا ہے بلکہ بعض معاملات میں کہنہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ادیب چوں کہ معاشرے کا حساس فرد ہوتا ہے لہذا وہ ان عناصر کو دوبارہ زندہ کرنے کی سعی کرتا ہے اور اس کا یہی عمل ثقافتی بازیافت ہے۔ لفظ بازیافت کسی چیز کو دوبارہ حاصل کرنے ، زندہ کرنے یا نئے انداز سے پیش کرنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ثقافتی بازیافت فراموش شدہ اور متروک ثقافتی عناصر کو نئے سیاق و سباق سے سامنے لانا ہے۔ دراصل اس عمل میں زبان، فنون، روایات، لباس، عقائد غرض ماضی کے ثقافتی ورثے کو دوبارہ زندہ کرنا ہے۔ یعنی ثقافتی بازیافت ایسے عمل کو کہتے ہیں، جس میں ان تمام عناصر کو نئی معنویت سے سامنے لانا ہے۔ بازیافت کی یہ صورت کبھی فکری، جمالیاتی تو کبھی سیاسی یا معاشرتی ہوتی ہے۔ بدلتی ہوئی معاشی و سیاسی صورت حال میں ثقافت کی رنگا رنگیاں کہیں دور ویرانوں میں رہ جاتی ہیں ایسے میں اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ مختلف طرح سے موجودہ لوگوں کو اپنے روایتی رنگوں سے واقف کرایا جائے۔ ثقافتی بازیافت کے مقاصد میں قومی شناخت کو محفوظ کرنا، موجودہ اور نئی نسل کو اپنے ماضی سے وابستہ کرنا، گلوبلائزیشن کے اس دور میں مقامی ثقافتوں کو قائم رکھنا اور اس کے ساتھ زمانہ پارینہ کے علمی، فکری اور فنی میراث سے کچھ نہ کچھ سیکھنا شامل ہیں۔

آج کے دور میں، جب ہر طرف مغرب کی اجارہ داری دکھائی دیتی ہے وہیں ثقافتی بازیافت کو مزاحمت کے طور پر بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ ثقافتی بازیافت کے عمل کو محض تخلیقی عمل ہی قرار نہیں دینا چاہیے بلکہ یہ فکری و نظریاتی طور پر ایک تحریک بھی ہے۔ اس عمل کے ذریعے ماضی کو حال سے جوڑتے ہوئے مستقبل کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ ثقافت کی بازیافت کی درست سمت اقوام کی ترقی، شعور اور آگاہی میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ ثقافتی بازیافت کے بارے میں مغربی مفکر Jan Assmanns یوں لکھتے ہیں:

> “Culture Memory has its fixed point, its horizon does not change with the passing of time. These fixed points are fateful events of the past, whose memory is maintained through cultural formation (texts, rites, monuments) are an institutional communication (recitation, practice, observance).”(3)

Jan Assmanns کا ثقافتی بازیافت کا نظریہ ثقافت، تاریخ، اور اجتماعی شناخت کے مطالعہ میں کافی حد تک موثر ہے۔ اپنے نظریے میں وہ ثقافتی بازیافت کے ضمن میں ایسے نکات کو سامنا لاتا ہے جو ثقافتی عناصر یا واقعات کی تحفظ و تدوین کو وضاحت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کا ایک اور اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> “Culture Memory preserves the store of knowledge from which a group derives an awareness of its unity and peculiarity.”(4)

ثقافتی بازیافت کسی بھی گروہ یا جماعت کی وحدت اور اس کی انفرادیت کو قائم رکھتی ہے۔ اس سے متعلقہ اقوام کو یہ احساس رہتا ہے کہ وہ مشترکہ تاریخ، اقدار اور ثقافت کا حصہ ہیں۔ اس کے ساتھ مختلف گروہ اپنی مخصوص روایات کی بنا پر دوسروں سے منفرد بھی نظر آتے ہیں۔ ثقافتی بازیافت کا عمل نہ صرف ماضی کو یاد رکھتا ہے بلکہ یہ ایک فعال سرگرمی ہے جو اجتماعی شناخت کو متشکل کرتی ہے۔ برصغیر پر نوآبادکار مسلط ہوئے تو مقامی باشندہ اپنی شناخت سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ مابعد نوآبادیات دراصل اس کی ثقافتی شناخت کی بازیافت ہے۔ ثقافتی بازیافت کا عمل بھی دراصل مابعد نوآبادیاتی مطالعے کے ضمن میں ٹھہرتا ہے۔ مابعد نوآبادیاتی مطالعہ نوآبادی ممالک کی سیاست، تاریخ، ثقافت، معاشرت اور تہذیب زبان کا مطالعہ ہے۔ اس ضمن میں کئی مفکرین مشرق و مغرب نے مختلف اصطلاحات سے اس دور کے ذہنوں اور ان کی نفسیاتی کیفیات کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

مابعد تقسیم ہند کا دور جنوبی ایشیائی خطے میں آزادی کا دور تصور کیا جاتا ہے مگر اس عرصے میں بہت سے ایسے حالات و واقعات رونما ہوئے ہیں کہ یہاں کے لوگوں نے اپنی اصلیت یعنی شناخت کو چھپانے میں عافیت سمجھی یا اس عمل میں ان کے مفادات پوشیدہ تھے۔ ہر دو صورتوں میں شناخت کی تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ ہومی کے بھابھا مابعد نو آبادیاتی شناخت کے ضمن میں اہم نام ہے۔ ان کا خیال ہے کہ استعماریت کے دور میں شناخت نہ تو استعمار کار کی ہوتی ہے اور نہ ہی استعمار زدہ کی بلکہ ایک ملی جلی سی صورت ہوتی ہے۔ ان کے ہاں شناخت کے تین طرح کے تصورات ملتے ہیں۔ Hybrid Identity, Mimicry, Ambivalence, ۔ جب بھی نو آبادیاتی طاقت مقامی لوگوں پر اپنا اقتدار قائم کرتی ہے تو مقامی آبادی نہ تو کلی طور پر استعمار کار کی شناخت اختیار کرتی ہے اور نہ ہی اپنی شناخت کو قائم رکھ پاتی ہے۔ اس صورت حال سے ایک ملی جلی سے شناخت پیدا ہوتی ہے جس سے مقامی اور نو آبادیاتی عناصر مکس ہو جاتے ہیں۔ ہومی کے بھابھا اس حوالے سے یوں لکھتے ہیں:

> “Colonial hybridity is not a problem of genealogy or identity between two different cultures which can then be resolved as an issue of cultural relativism.Hybridity is a problematic of colonial representation and individuation that reverses the effect of the colonialist disavowal,so that other denied knowledge enter upon the dominant discourse and estrange the basis of its authority –its rules of recognition.” (5)

شناخت کے بحران کی دوسری صورت نقل کی ہے۔ استعماری طاقتیں اس بات پر زور دیتی ہیں کہ مقامی لوگ ثقافت، زبان، رسوم رواج غرض ہر پہلو سے ان کی تقلید کریں لیکن یہ شناخت کبھی مکمل نہیں ہوتی۔ بظاہر دوسرے ثقافتی رنگ اختیار تو کیے جاتے ہیں مگر اپنی اصل پہچان سے آسانی سے پیچھا نہیں چھڑایا جا سکتا۔ تیسری صورت جو کہ ہومی کے بھابھا نے شناخت کے حوالے سے واضح کی ہے وہ تضاد یا دوجذبی رویہ ہے۔ جب بھی کوئی نو آبادکار کہیں مسلط ہوتا ہے تو اس کے ذہن میں یہ نظریہ بھی موجود ہوتا ہے کہ زیر نظر آبادی غیر مہذب ہے لہذا قابض ہونے کے بعد وہ انھیں ترقی دینا چاہتے ہیں تا کہ وہ دنیا کی نظر میں مہذب کہلوائیں مگر ساتھ ہی انھیں ماتحت بھی رکھتی ہیں۔ یہ انتشار مقامی شناخت میں بحران کا سبب بنتا ہے۔ شناخت کا بحران مابعد نو آبادیاتی دور کے ادب میں جا بجا ملتا ہے۔

ٹراما ایک نفسیاتی اصطلاح ہے جو شدت آمیز اور انتہائی تکلیف دہ تجربات کے اثرات کو کہا جاتا ہے۔ یہ تجربہ انسان کی ذہنی، جسمانی اور جذباتی سطح پر گہرے اور دیرپا اثرات مرتب کرتا ہے۔ دراصل یہ واقعات کا نتیجہ ہوتا ہے اور اس سے انسان بے بسی، خوف ڈر، مایوسی اور ذہنی دباؤ کا شکار ہو جاتا ہے۔ جس سے فوری طور پر نکلنا ممکن نہیں ہوتا۔ Cathy Caurth اس ضمن میں لکھتی ہیں:

> “Trauma is not located in the simple violent or original event in an individual’s past, but rather in the way that its very unassimilated nature – the way it was precisely not known in the first instance –returns to haunt the survivor later on.” (6)

ٹراما پوسٹ کولونیل اصطلاح ہے جس کے تناظر میں کولونیل ادب کو پرکھا جاتا ہے۔ ادب میں انفرادی و اجتماعی المیوں مثلاً ہجرت، تقسیم، جنگ اور مہاجرت وغیرہ کے پس منظر میں ٹراما پیش کیا جاتا ہے۔ اردو ادب میں ثقافتی بازیافت کی روایت گہری اور متنوع رہی ہے۔ مختلف ادوار میں مصنفین ادب نے روایات، اقدار، علامتوں کی نئے سیاق و سباق سے نہ صرف بازیافت کی بلکہ انھیں نئی معنویت بھی عطا کی۔ ان مصنفین میں اقبال، فیض احمد فیض، شکیب جلالی، انتظار حسین، عبداللہ حسین، شمس الرحمان فاروقی اور مستنصر حسین تارڑ جیسے ادیب قابل لحاظ ہیں۔ خشونت سنگھ کے ہاں ہجرت اور تقسیم کے دردناک بیانات ملتے ہیں۔ ان کا ناول پاکستان ایکسپریس اس حوالے سے خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ ناول میں مختلف کرداروں کے ذریعے وطن کے ایک حصے سے دوسرے کی طرف ہجرت کرنے کے کرب کو بہ خوبی دیکھا اور محسوس کیا جاسکتا ہے۔ نہ صرف اپنے گھر کو چھوڑنا بلکہ پاکستانی خطے سے کسی طرح کی امید بھی وابستہ نہیں کی جاتی۔ کرداروں کی زبانی انھوں نے تقسیم اور اس کے نتیجے میں عدم اعتماد کی صورت حال کو بہترین طریقے سے بیان کیا ہے۔ "ہم نے پاکستان سے کیا لینا ہے۔ ہم نے یہاں جنم لیا ہے۔ ہمارے اجداد یہیں پیدا ہوئے تھے۔ ہم آپ کے ساتھ بھائیوں کی طرح رہتے ہیں۔"(7)

۱۹۴۷ء میں جب ہر طرف ہجرت کا شور برپا تھا امام بخش کے یہ الفاظ اپنے سکھ بھائیوں سے اپنائیت کا بھرپور اظہار کر رہے ہیں۔ جب وہ اپنی بیٹی نوراں کو سامان باندھنے کا کہتا ہے تو نوراں کا انکار اپنے وطن سے محبت کو ظاہر کرتا ہے۔ خشونت سنگھ نے تقسیم کو محض سیاسی واقعہ نہیں سمجھا بلکہ اسے انسانی سانحے کے طور پر دیکھا ہے۔ "مجھے پاکستان نہیں جانا۔ لڑکی نے جوش میں آکر کہا۔ تم جاؤ نہ جاؤ وہ تمھیں خود ہی نکال دیں گے۔"(8)

ایک طرف یہ اقتباس اپنی زمین سے محبت کا اظہار ہے وہی دوسری طرف اقتباس کا آخری جملہ بے چارگی اور بے بسی کی نمائندگی بھی کرتا ہے۔ خشونت سنگھ نے تقسیم ہند کے حقائق نہ صرف سیاسی بلکہ انسانی سطح پر بھی پیش کیے ہیں۔ بنیادی طور پر ہجرت کے کرب کو انھوں نے انتہائی شدت، دیانت داری اور انسانی جذبے کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اسی طرح اس ضمن میں اردو کے نمائندہ ناول "اور انسان مر گیا" از رامانند ساگر، "اک اور خون" از نسیم حجازی، "سفینۂ غم دل"، "آگ کا دریا" از قراۃ العین حیدر، "غدر" از کرشن چندر، "بستی" از انتظار حسین، "تلاش بہاراں" از جملہ ہاشمی، "اداس نسلیں" ا زعبداللہ حسین، "آنگن" اور "زمین" از خدیجہ مستور تقسیم ہند، فسادات اور ہجرت کے واقعات سے مملو ناول ہیں۔ جن میں اس وقت کے انسان کی مہاجرت، بے بسی، آزادی و تقسیم، ثقافت و تہذیب جیسے مضامین بہ طور خاص ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ نے اپنے ناولوں میں پاکستانی ثقافت کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ عیاں کیا ہے۔ پاکستان کے مختلف علاقوں کی ثقافت پر ان کے ناولوں میں کافی تفصیلات ملتی ہیں۔ ان کے ناول "قربت مرگ میں محبت"، "بہاؤ"، "اے غزال شب"، "پرندے"، "قلعہ جنگی" کے علاوہ "خس و خاشاک زمانے" میں بھی برصغیر کی ثقافت اور پاکستان کی دیہی معاشرت کا وہی رنگ دکھائی دیتا ہے جو "دیس ہوئے پردیس" اور "راکھ" میں نظر آتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کی تخلیقی صلاحیت اور ہمہ جہتی پہلوؤں کے حوالے سے مختلف ناقدین نے بڑے عمدہ انداز میں اظہار کیا ہے۔ عرفان جاوید اس حوالے سے یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

> "مستنصر حسین صاحب ایسے کاہن ہیں جو بے جان الفاظ کو چھو کر زندگی دیتے ہیں۔ سنجیدہ ادب میں تارڑ صاحب کے خزانے میں بین الاقوامی معیار کی بے شمار اعلیٰ ادبی تحریریں ان کے قد آور اور ہمہ جہت ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔"(9)

تاڑر صاحب کا ناول "خس و خاشاک زمانے" ۲۰۱۰ء میں شائع ہوا۔ انہوں نے "خس و کاشاک زمانے" میں ثقافتی بازیافت کے لیے بیانیہ اسلوب اپنایا ہے۔ جس میں ذاتی مشاہدات اور تجربات کو مؤثر طور پر پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ انھوں نے مقامی رسم ورواج اور دیہی زندگی کی تفصیلات کو نثر میں سمو کر ثقافتی ورثے کو زندہ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ مزید براں ان کا اسلوب سادہ، پر اثر اور جذبہ وابستگی سے لبریز ہے جو قاری کو ماضی کی تہذیب و ثقافت سے جوڑتا ہے۔ اس ناول میں تاریخ، بدلتی تہذیبی و ثقافتی صورت حال، تقسیم ہند، قیام پاکستان کے بعد کی ابتدائی سالوں کی ڈگمگاتی صورت حال، ہند و پاک کے درمیان ہونے والی جنگیں، شناختی بحران، اسلامو فوبیا، مرگ و زیست کی کشمکش، انسانی رویے، مذہبی انتہا پسندی، رسم و روایات اور نسلی امتیازات جیسے پہلو بیان کیے گئے ہیں۔ گویا ناول کا فکری پہلو مضبوط و مستحکم ہے۔ بہ قول منشایاد:

> "اس ناول کا کوئی ایک موضوع متعین نہیں کیا جا سکتا۔۔۔اور اسے کسی ایک جگہ تک محدود نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں برصغیر پاک و ہند اور دنیا کے بہت سے اہم واقعات و سانحات اور تاریخی حوالے ملتے ہیں"(10)

"خس وخاشاک زمانے" دراصل بیسویں صدی کا تاریخی بیانیہ ہے۔ یہ صدی مختلف انسانی رویوں، تغیر آمیز تہذیب و ثقافت، آخری سانسیں لیتی سماجی، معاشی اور فکری نظریات کی صدی تھی۔ جس میں لوگ ہر میدان میں ایک نئی صورت حال کو دیکھنے جا رہے تھے۔ اس ناول کی کہانی پاک و ہند کی سرزمین سے پھوٹتی ہوئی کینیڈا اور امریکہ کی سرحدوں پر اختتام پذیر ہوتی ہے۔ اس سفر میں مختلف جگہوں پر ایسے مقامات آتے ہیں جہاں کرداروں کی اندرونی توڑ پھوڑ نظر آتی ہے۔ مگر کہیں اس کشمکش میں کرداروں کو سکون نصیب ہو جاتا ہے تو کہیں موت کو گلے لگانا پڑتا ہے۔ ناول کا پہلا حصہ ماقبل آزادی کا بیان ہے جہاں ایک زندہ تہذیب موجود تھی۔ ایسی تہذیب جس میں مذہب اور قومیت نے ذہنوں کو اس احساس میں ڈبویا نہیں تھا کہ ایک جگہ بسنے والے لوگ کس مذہب یا قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ جاٹ خاندان مذہبی طور مسلم و غیر مسلم ہونے کے باوجود جاٹ ہی تھا۔ ان کی عادات، فکر، رواجوں میں ہم آہنگی تھی۔ ایک ایسی دنیا آباد تھی جن کا کام محض بیلوں اور کھیتوں کو ہرا کرنا تھا۔ ان کے ہاں ان کاموں کے علاوہ کوئی بھی کام معتبر نہ تھا۔ علم سے نفرت سکھ اور مسلمان جاٹوں میں مشترکہ قدر تھی۔ یہ حصہ اس دور کی نمائندگی کر رہا ہے جب پاک و ہند ایک سلطنت تھی ۔ تمام تر بری اور گھٹیا عادتوں کے باوجود ایک دوسرے کی خوشیوں اور غموں میں شرکت کی جاتی تھی۔ دوستی اور رشتہ داری نبھانے میں آپسی تفاوت یا رنجش کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ اس ضمن میں بخت جہاں اور لہناں سنگھ کی دوستی اور خاص کر امرت کور کا اپنے بچوں سمیت بخت جہاں کی طرف آنا عمدہ مثال ہے۔

> "بخت جہاں کو دیکھ کر لہناں سنگھ کے چہرے پر نہ کوئی اشتعال پھوٹا اور نہ ہی آنکھوں میں کسی شکایت کا پر تو تیرا۔۔۔ لہناں سنگھ نے اپنی داڑھی میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا، جہانیاں ۔۔۔رن تلوار اور گھوڑا کسی کے سگے نہیں ہوتے۔ کسی سے وفا نہیں کرتے۔۔۔ ان تینوں کو اگر وہ تمہارے پاس نہ رہیں تو کھلا چھوڑ دو۔ گھوڑے بھی بہت، تلواریں بھی بہت اور رنوں کی بھی کچھ تھوڑ نہیں۔۔ البتہ یاروں کی بہت تھوڑ بہت کمی ہوتی ہے تو چنتا نہ کر۔ رن تلوار اور گھوڑا آج تک کسی کے نہیں ہوئے۔۔ تیرے بھی نہیں ہوں گے۔"(11)

یہ اقتباس جہاں دو مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی دوستی کا عکاس ہے وہیں اس وقت کی معاشرت کو بھی ظاہر کر رہا ہے جہاں نسلی تفاخر رشتوں کو بھی پامال کرتا جا رہا تھا اور شرمندگی کا عنصر کہیں پھوٹے بھی تو اپنی مست دنیا میں دبا لیا جاتا تھا۔ ساتھ ہی بخت جہاں کا کردار پنجاب کے جاٹوں کی ثقافت کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے۔ یہ لوگ اپنی

جنسی ہوس کو پورا کرنے کے لیے کسی حد بندی کے قائل نہیں تھے۔ حتیٰ کے اپنے ملازمین کی ان عورتوں کے لیے بھی کوئی معافی نہیں تھی جن کو گالی گلوچ کے علاوہ پکارا ہی نہیں جاتا تھا۔ جنسی خواہش کی تکمیل اور عاشقی معشوقی کے معاملات پر جاٹوں کی اجارہ داری تھی۔ جاٹوں کا یہ مشترکہ پن دیہی کلچر، غیر جانبدارانہ رویے اور ان کی نفسیات کا قاری کے سامنے واضح کرتا ہے۔ ناول "خس وخاشاک زمانے" میں پنجاب کے دیہات کی ثقافت پوری شدو مد کے ساتھ موجود ہے۔ تارڑ نے دیہاتی زندگی کی عکس بندی اتنی عمدگی کے ساتھ کی ہے کہ اس کی مکمل تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ انھوں نے ناول میں بطور خاص پاکستان کے قیام سے پہلے کے پنجاب کو موضوع بنایا ہے۔ جس میں مذہبی تفریق کے بغیر لوگوں میں ایک دوسرے سے ہم آہنگی تھی۔ پنجاب کی دیہاتی ثقافت، دیہات کے باشندوں کا رہن سہن، طرز زندگی، رسم ورواج، تہذیب، ان کا خلوص، بھائی چارہ اور سادگی کا رنگ دکھائی دیتا ہے۔ درج ذیل اقتباس میں گاؤں کے افراد میں پائی جانے والی ثقافتی اقدار جیسے خلوص واپنائیت کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

> ”وہ ہانڈی پہ جھکی اپنی ماں سے پوچھتا ہے، "بے بے آج کیا پکایا ہے"؟ اور وہ سر اٹھا کر کہتی ہے ٹینڈے ہیں، اس کے انکار کے بعد بے بے فوری طور پر آس پاس کے جتنے بھی کوٹھے آباد تھے ان سے سوال کرتی ہے "کیا پکایا ہے"۔۔ اور ادھر سے جواب آنے لگتے ہیں۔ چاول ہیں گڑ والے۔۔ چنے کی دال ہے۔۔ تنوری پراٹھے۔۔ باتھو کا ساگ۔۔ توریاں ہیں،۔۔۔ امیر بخش ان میں سے کسی ایک خوراک کا چناؤ کر لیتا۔"(12)

اسی طرح تارڑ نے گاؤں میں ہونے والی شادی بیاہ اور اس کے متعلقات کو فروعات کے ساتھ ناول میں سمویا ہے۔ گاؤں میں شادی کے دنوں میں دھوم دھام عروج پہ ہوتی ہے۔ ہر ایک فرد حتی المقدور شادیوں کی تقریبات میں حصہ لیتا ہے۔ درجنوں کی تعداد میں دیگیں پکائی جاتی ہیں۔ مختلف اقسام کے کھانے پکائے جاتے ہیں۔ گاؤں میں شادی بیاہ کے معاملات میں اپنے خاندان، ذات اور برادری کے افراد کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اس بات کی عکاسی درج ذیل اقتباس سے ہوتی ہے:

> "دیہات میں جو بیاہ ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی بھی ذات برادری سے باہر نہیں جاتا۔ نسل در نسل شادیاں آپس میں ہوتی چلی جاتی ہیں اور اپنی نسل یا ذات سے انحراف سے بھی زیادہ سنگین معاملہ سمجھا جاتا ہے۔ اور یوں ان سب کی شکلوں میں ایک واضح مماثلت ہوتی ہے۔" (13)

گاؤں میں باراتیوں اور دلہن کا ڈھول کی تھاپ پہ استقبال، جہیز کی کھلی جگہ پہ نمائش، گاؤں والوں کا کاموں میں ہاتھ بٹانا دراصل گاؤں کی ثقافت کی عکاسی ہے۔ ناول میں اس عہد کے کسانوں کی مشقت اور تکالیف کا ذکر بھی ہے۔ جیسے

اس وقت کسان ہل کے ذریعے کھیتی باڑی کرتے ہیں، ہاتھوں سے فصل کاٹنا، فصلوں کی سیرابی کے لیے کچی نالیاں بنانا ایک مشقت طلب کام تھا۔ جاٹوں کے ساتھ سانسی نسل کے لوگ بھی آباد تھے جو کسی بھی مذہب، فرقے یا نظریے کے قائل نہیں تھے بلکہ بالکل آزاد پیدا ہوئے تھے۔ جن کے نزدیک پیٹ بھرنا اہم تھا ذریعہ چاہے جو بھی ہو۔ سروسانسی اس سرزمین کی قدیم تہذیب اور نسل کا نمایاں کردار ہے۔ یہ لوگ جاٹوں کے لیے انتہائی کم تر اور چھوٹے اور گندے لوگ تھے جو صرف چوہدریوں تک کیکر کی بنی خالص شراب پہنچا سکتے تھے۔ ناول نگار نے سانسی نسل کے خدوخال، غذائی عادات اور خصائل کو باریک بینی سے بیان کیا ہے۔

> "سانسی لوگ تنومند اور مضبوط قد کاٹھ کے ہوتے تھے۔۔۔ انہیں کسی بھی جنور سے پرہیز نہیں تھی۔ کتے، جنگلی بلے، کچھوے، گلہریاں اور نیولے ان کے مرغوب ترین غذا تھی۔"(14)

سانسی نسل تقسیم کے بعد مٹ جانے والی ہوتی ہے مگر سرو کے بیٹے اپنی ایک الگ شناخت قائم کرتے ہیں اور اس سماج میں زندہ رہتے ہیں۔ ناول چوں کہ شناختی بحران کو بھی بیان کرتا ہے۔ سلیمان شاہ اور ابراہیم شاہ ایسے ہی کردار ہیں جو تقسیم کے عمل میں ہونے والے ہنگامے سے خود کو بچانے کے لیے اپنی اصل سے ہی رخ موڑ لیتے ہیں اور معاشرے میں نہ صرف اپنے نئے نام بلکہ ثقافتی پہلوؤں کو بھی اپناتے ہیں جن سے وہ محض نظر آشنا تھے۔

> "دیکھ چاچا تو خود سرو امیر عزیز کنسٹرکشن کمپنی کا ڈائریکٹر ہونے کے باوجود ابھی تک ذہنی طور پر دنیا پور کے اسی جھونپڑے میں ہے اپنے آپ کو سانسی کہلانے میں فخر محسوس کرتا ہے اور ہمیں بھی ذلت میں دھکیلتا ہے۔ تیرے اس پاکستان میں کیا کیا کچھ نہ ہو گیا۔ وڈیرے اور طوائفوں کی اولاد نواب زادے اور صاحب زادے وزیر کبیر ہو گئے تو اگر ہم سانسی۔۔ صرف اپنی شناخت تبدیل کر کے مسلمان اور سید ہو جاتے ہیں تو کسی کا کیا جاتا۔"(15)

درج بالا طویل اقتباس سروسانسی کے بیٹوں کی ذہنیت کو نمایاں کرتا ہے۔ شناخت کا یہ مسئلہ اس وقت شروع ہوتا ہے جب پاکستان کے وجود میں آنے اور سقوط ڈھاکہ کے واقعات رونما ہوتے ہیں۔

> "۔۔ یہ سب لوگ جاٹ، سید، ملک اور نواب زادے جانے کہاں سے آئے۔ پر صرف ہم جانتے ہیں کہ ہم کہیں سے نہیں آئے، ہزاروں برسوں سے اسی مٹی میں پیدا ہوتے اور اسی میں دفن ہوتے رہے ہیں۔"(16)

ایک طبقہ جہاں اپنی بقا کے لیے خود کو ایک شناخت دے رہا تھا وہیں دوسری طرف سرو جیسے لوگ اپنی اصل کو قائم رکھنے پر زور دے رہے تھے اور اپنی اصل کو چھپانے پہ نوحہ کناں تھے۔ اور ساتھ ہی باہر سے آنے والے لوگوں کو اپنے اوپر گزرتے ہوئے حالات کا ذمہ دار سمجھ رہے تھے۔ لہناں سنگھ، بخت جہاں اچھو شیخ، محکم دین، بہشت بی بی، امرت کور، صاحباں، الف جہاں، رابعہ بی بی، اور فتح جہاں نمبر دار ایسے کردار تھے جو مرتے دم تک اپنی مٹی اور ثقافت سے جڑے رہے۔ اس بات سے بے پروا کہ وقت ان کے ذہنوں پر پردہ ڈالتے ہوئے کب کا گزر گیا۔ لہناں سنگھ اور بخت جہاں ایک ہی ثقافت سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے جو اپنی زمیں سے جڑے رہے مگر ان کی نسل کے لوگوں نے حالات کی گردش کو بھانپتے ہوئے دوسری جگہوں کا رخ کیا تو اپنے سامنے ایک نئے جہاں کو پایا۔

ناول کا دوسرا حصہ لاہور سے شروع ہوتا ہے جس کا کردار امیر بخش ہے۔ جو ترقی پسندانہ سوچ کا متحمل کردار ہے جو ذات، رنگ اور نسلی تفاخر کے متعصب رویے سے بالاتر ہے۔ عقائد کو انسان کا نجی معاملہ سمجھتا ہے اور مذہب کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کے منافی ہے۔ امیر بخش کے نزدیک انسانیت سب سے پہلے ہے کوئی فرد کسی بھی ثقافتی پس منظر یا نسل سے تعلق رکھتا ہو سب اس دنیا میں ایک ہی کشتی کے مسافر ہیں اور ہر کوئی اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا ہے جس کا اسے پورا حق حاصل ہونا چاہیئے۔ امیر بخش پڑھا لکھا کردار ہے جو تعلیم کے زیور اور سفر کی بدولت اپنی سوچ کو جاٹوں کے اثر سے آزاد کر پاتا ہے۔ اس کا سفر لاہور نہ صرف اس کی سوچ کو وسعت دیتا ہے بلکہ ایک نئے ماحول میں وہ اپنے رہن سہن کو بھی بدلتا ہے۔ اپنے گاؤں کوٹ ستارہ میں وہ یوں بھی دو طرح کے ماحول اور کچھ ثقافتی تبدیلیوں کے بارے میں سوچ بچار کرتا رہتا تھا۔ میٹرک کے بعد روزگار حاصل کرنے کی ٹھوکروں نے اسے بالکل ہی بدل دیا۔ تھانیدار محمد خوشی کے کتوں کا کاٹنا ہمیشہ کے لیے اسے احساس محرومی کا شکار کر دیتا ہے۔

> "وہ اپنی جان بچانے کے لیے اندھا دھند بھاگا چلا جا رہا تھا تو ان چند لمحوں میں اس پر سارے
> بھید آشکار ہو گئے۔۔ یہ حیات زور آوروں کی تھی۔۔ برادری ایک ڈھکوسلا تھی۔ قبیلہ
> ایک نیند آور حماقت تھی۔ اور مذہب ایک دلاسا تھا۔ ان سب کی کوئی وقعت نہ تھی۔"(17)

بیگانہ شہر اور نوکری کی تلاش میں خاک چھاننا اسے اس حقیقت سے آگاہ کر دیتا ہے کہ وہ ایک الگ دنیا سے تعلق رکھتا ہے۔ سماجی و معاشرتی اقدار کی تبدیلیاں کب کی رونما ہو چکی تھیں جن سے امیر بخش جیسے لوگوں کے گاؤں والے نابلد اپنے ہی مروجہ اقدار میں جیتے جا رہے تھے۔ امیر بخش کی بیوی نور بیگم کا شادی کے بعد لاہور کی طرف جانا اور وہاں کے لوگوں کا رہن سہن اور عادات اسے بھی ایک نئی ثقافتی رجحان سے روشناس کراتے ہیں۔ مکمل طور پر برقعے میں ڈوبی ہوئی، اپنی چار دیواری سے کبھی بھی باہر نہ جھانکنے والی عورت جب لاہور کی سڑکوں میں گاڑیوں، نوابوں کی عورتوں کا کتوں کے ساتھ لاڈ پیار اور یوں سرعام گھومنا پہلے پہل اسے لاہور سے دور بھی کرتا ہے مگر دھیرے دھیرے یہ ثقافتی

رنگ اسے بھی اختیار کرنا پڑتا ہے۔ گو کہ وہ مکمل طور پر اس رنگ میں خود کو رنگتی نہیں ہے۔ کہیں نہ کہیں وہ خود کو بدلتی قدروں کے ساتھ جوڑے ہوئے ہے۔ روشن اور انعام اللہ کے کردار نائن الیون کے نتیجے میں رونما ہونے والے حالات اور مغرب کی ثقافتی صورت حال کو بیان کرتے ہیں۔ انعام اللہ کا کردار بطور ناول نگار کے ہمارے سامنے آتا ہے۔ تقسیم کا لفظ محض علاقائی حدود تک نہ تھا بلکہ مختلف النوع مذہبی فکر کے لوگوں کو بھی نشانہ بنایا گیا تھا۔ اپنے حرام ہونے کی شناخت کا اقرار پاکستانی معاشرے میں اسے سزا کا حق دار ٹھہراتا ہے۔

> "یہ پود جو مردہ مینڈک ایسی آنکھوں والے کی بوئی ہوئی ہے
> تم جیسے لوگوں کو تلف کر دینا چاہتی ہے اور کر دے گی۔"(18)

امیر بخش کا انعام اللہ کو وطن ترک کرنے کی طرف راغب کرنا ہے کیوں کہ مذہب کو بطور ہتھیار استعمال کرنا اسے واضح طور پر نظر آ گیا ہے۔ انسانیت سے زیادہ طاقت وروں کو خوش کرنے کے چکر میں اپنے ہم وطن کو مذہبی آڑ میں گزند پہنچانا نئے حکمرانوں کا طریقہ بن چکا تھا۔ انعام اللہ کردار ایک جگہ رکنے کی بجائے امریکہ اور پھر وہاں سے کینیڈا کا سفر کرتا ہے۔ ہجرت در ہجرت کے تناظر میں یہ کردار انتہائی جان دار ہے۔ نائن الیون کا سانحہ انعام اللہ کے امریکہ میں ہوتے ہوئے ہی رونما ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کے غم اور بے بسی کو شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے اور افغانستان کی صورت حال کو ذہن میں لاتے ہوئے سوچتا ہے کہ کس طرح وہاں بے گناہ لوگوں کو زبردستی مسائل کی طرف گھسیٹا جا رہا ہے۔ ناول نگار نے انسانی لاشوں کو گڈوں سے تشبیہ دی ہے کہ یہ گڈے تہہ میں پھیلے خلا سے کسی بھی وقت کہیں کاٹے جا سکتے ہیں۔ انعام اللہ کی گاڑی کے شیشے پر ایک لاش آ گرتی ہے جس سے اس کی سوچوں کا تانا بُننا شروع ہوتا ہے۔

> "ونڈ اسکرین پر گڈا اسے تکتا تھا۔۔ اور اگلے لمحے واٹر جو مسلسل کوشاں
> تھے، زور لگاتے ہوئے پھر سے حرکت میں آ گئے اور اس گڈے کو ونڈ
> اسکرین سے سمیٹ کر تاریخ کے کوڑے دان میں پھینک دیا۔"(19)

نسوانی کرداروں میں شباہت کا کردار وہ کردار ہے جو مکمل مغرب سے تربیت یافتہ ہے۔ عالمی جنگوں کے پڑتے اثرات میں یہ کردار پروان چڑھتا ہے۔ اس کے تمام اطوار مغربی معاشرے کا عکس ہیں۔ سانسی نسل کی آخری نشانی کے طور پر اس کردار کو دیکھا جاتا ہے۔ شباہت کا ہاتھی جمع کرنے کا شوق اس کا ایک انوکھا پہلو ہے۔ اس کا یہ عمل غماز ہے کہ تاریخ خود کو کہیں نہ کہیں دہراتی رہتی ہے اور جگہ بدل دینے سے بھی بعض اوقات خاندانی عادات چھوٹتی نہیں ہیں مگر ان کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ شباہت کا کردار تہذیبی و ثقافتی کشمکش میں مزاحمتی کردار کے ضمن میں بھی لیا جا سکتا ہے جو اپنے مرضی کے فیصلوں پر یقین رکھتی ہے اور اپنی خواہش کی تکمیل میں کسی بھی چیز کو رکاوٹ نہیں بننے دیتی۔ دراصل وہ قدیم سائنسی دانش کا عکس ہے جو زندگی کے حقائق کو انعام سے زیادہ بہتر انداز میں سمجھتی ہے۔

ناول "خس و خاشاک زمانے" تین نسلوں کے رویوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یہ رویے کسی ایک سماج کے نہیں ہیں۔ ناول میں دیہاتی زندگی کے ساتھ ساتھ لاہور کی ثقافت اور لاہور کی شہری زندگی کی منظر کشی بھی کی گئی ہے۔ تقسیم اور ماقبل تقسیم کا منظر نامہ دلفریب انداز میں بیان ہوا ہے۔ تین نسلوں کی یہ داستان تقسیم ہند کے حاصل میں رونما ہونے والی مذہبی، معاشی، معاشرتی، تہذیبی، ثقافتی اور سیاسی انتشار کو بیان کرتی ہے۔ ہر نسل میں ایک کردار متحرک و یادگار ہے۔ تہذیبی و ثقافتی اتار چڑھاؤ اور نئے ماحول اور حالات کا سامنا ناول کے کرداروں کو پُر اثر بناتا ہے۔ ناول میں فلیش بیک کی تکنیک استعمال کی گئی ہے یعنی بعد میں پیش آنے والے واقعہ کی ایک مختصر جھلک دکھائی گئی ہے۔ جس کے ذریعے سے ثقافت کو عیاں کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ تقسیم کا المیہ بھی موجود ہے جب برسوں سے ساتھ رہنے والے لوگ کیسے ان جانے میں وقت کے ہاتھوں کچلے جاتے ہیں اور ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے ہیں۔ محض اس بیانیے پر جس کا انہیں ادراک بھی نہیں ہوتا۔ مذہب، الگ وطن کا جذبہ، بنگال کو سر کرنا زیادہ غالب بیانیے کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ یہ بیانیے اس قدر شدت اور طاقت سے بنائے اور پھیلائے گئے کہ ایک نسل سے دوسری نسل سے اور ایک مقام سے دوسرے مقام پہ جانے والے بھی اس کی زد سے نہ بچ سکے۔ ناول کا ایک خاصا یہ بھی ہے کہ اس کا اختتام بہت امید افزا ہے یعنی دنیا کو ایک نئے زاویے سے آباد کرنے کی خواہش ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کی تخلیقات میں ثقافتی بازیافت کی روایت نمایاں رنگ لیے ہوئے ہے۔ وہ نہ صرف ماضی کی ثقافت، تاریخ اور معاشرتی اقدار کو اپنی تحاریر میں شامل کرتے ہیں بلکہ ان میں نئی معنویت بھی پیدا کرتے ہیں۔ ان کا یہ روویہ اس بات کا بھی عکاس ہے کہ مستنصر حسین تارڑ کو اپنے ثقافتی ورثے میں حسن و تاثیر کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس ناول میں مستنصر حسین تارڑ نے محض کہانی نہیں سنائی بلکہ انھوں نے گزشتہ عہد کو ادب کے آئینے میں زندہ کیا ہے۔ دیہی و شہری ثقافت، زبان، محبت، رشتے اور تاریخ کو از سرنو تخلیق کر کے قاری کو اس کے ثقافتی ورثے سے متعارف کرایا ہے۔ اس ناول کو اردو ادب میں ثقافتی بازیافت کا نمائندہ فن پارہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کیوں کہ یہ قاری کو ماضی کی خوب صورتی، موجودہ زوال اور بہتر مستقبل کا احساس دلاتا ہے۔

حواشی وحوالہ جات

1۔ عابد حسین، سید، قومی تہذیب کا مسئلہ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 1998ء، ص 15

2۔ ڈاکٹر عبد الباری، لکھنو کے شعر و ادب کا معاشرتی و ثقافتی پس منظر، جی ایس پی جی کالج سلطان پور، یوپی، مئی 1987ء، ص 22

3۔ جان آسمان، جون زپلیکا، کولیکٹیو ممری اینڈ کلچرل آئیڈینٹیٹی، نیو جرمن کریٹک، نمبر 65، کلچرل ہسٹری (سپرنگ، سمر، 1995ء)، ص 129

4۔ ایضاً، ص130

5۔ ہومی کے بھابھا، دی لوکیشن آف کلچر، روٹ لیج لندن اینڈ نیویارک، 1994، ص114

6۔ کیروتھ سی، ان کلیمڈ ایکسپیرینس: ٹراما، نیریٹیو اینڈ ہسٹری، جون ہاپکنز یونیورسٹی پریس، ص4

7۔ خشونت سنگھ، پاکستان ایکسپریس، مسعود منور (مترجم)، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 1996ء، ص80

8۔ ایضاً، ص83

9۔ غفور شاہ قاسم، ڈاکٹر، مستنصر حسین تارڑ: شخصیت اور فن، اکادمی ادبیاتِ پاکستان، اسلام آباد، 2018ء، ص227

10۔ منشایاد، خس وخاشاک زمانے پر تبصرہ، ماہنامہ الحمرا، لاہور، نومبر 2011ء، ص42

11- مستنصر حسین تارڑ، خس وخاشاک زمانے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2017ء، ص75

12۔ ایضاً، ص129

13۔ ایضاً، ص110

14۔ ایضاً، ص161

15۔ ایضاً، ص383

16۔ ایضاً، ص384

17۔ ایضاً، ص113

18۔ ایضاً، ص42

19۔ ایضاً، ص421

References in Roman Script:

1. Abid Hussain,Syed, Qaumi Tehzeb ka Masla, Qaumi Council bray Frogh e Urdu Zaban, New Delhi, 1998, p. 15
2. Abdual Bari, Dr, Luckhnow k shair o adab ka moasharti o saqafti pas manzr, GSPG, college, UP, May 1987, p. 22
3. Jan Assmann, John Czaplicka, Collective Memory and Cultural Identity, New German Critique, No:65, Cultural History, (Spring, Summer, 1995) p. 129
4. Ibid, p. 130
5. Homi.K.Bhabha, The Location Of Culture, Routledge London and Newyork, 1994, p. 114
6. Caruth,C, Unclaimed experience:Trauma,narrative, and history, John Hopkins University Press, 1996, p. 4
7. Khushwant Singh, Pakistan Express, Mashood Manvar (Mutrajim), Modren Publishing House, New Delhi, 1996, p. 80
8. Ibid, p. 83
9. Ghafour Shah Qasim, Dr, Mustansir Hussain Tarar:shakisat o fun, Pakistan Academy of letters, Islamabad, 2018, p. 227

10. Mansha Yaad, Khas o Khasak Zamany pr Tabsra, Mahnama Alhamra, Lahore, November 2011, p. 42
11. Mustansir Hussain Tarar, Khas o Khasak Zamany, Sang e Meel Publications, Lahore, 2017, p. 75
12. Ibid, p. 129
13. Ibid, p. 110
14. Ibid, p. 161
15. Ibid, p. 383
16. Ibid, p. 384
17. Ibid, p. 113
18. Ibid, p. 42
19. Ibid, p. 421